Tarseel, Vol. 15 (ISSN : 0975-6655)
A Peer Reviewed Reserch Journal of Urdu
Direcotrate of Distance Education,
University of Kashmir
Pp 115-127

مشترکہ تہذیبی کلامیہ اور اردو زبان

(مولانا وحیدالدن خان کی تحریروں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

ڈاکٹر عرفان عالم

تلخیص

ادب کسی بھی معاشرے کے فکری اور جمالیاتی رویّوں کا ایک ایسا ترجمان ہوتا ہے جس میں اُس معاشرے سے وابستہ ہر شخص کی آرزوؤں اور امنگوں اور تعصّبات وترجیحات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی معاشرہ تقسیمِ برصغیر کے بعد جس ٹوٹ پھوٹ اور انتشار واضطراب کا شکار ہوا ہے اُس کی کوئی بھی مثال تاریخ میں ناپید ہے۔ اردو زبان اور ادب نے اس تہذیبی اور ثقافتی انتشار کو کس طرح انگیز کیا ہے اس کا جائزہ لینے کی کوشش زیرِ نظر مقالہ میں نظر آتی ہے۔ مقالہ نگار نے اردو ادب کی مختلف نثری اصناف کی تعمیر وتشکیل پر مباحثہ قائم کر کے اپنے استدلال کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس مقالے میں مقالہ نگار نے اسلام کے معروف اسکالر اور راہنما مولانا وحیدالدین خان کی نثری تحریروں کا تجزیہ پیش کر کے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ موصوف موجودہ ہندوستان میں اُردو زبان کے ایسے سرکردہ دانشور ہیں جنہوں نے اپنے معروف اور مشہور رسالہ ''الرسالہ'' میں مشترکہ تہذیب کے سچے اور پکے علمبردار ہونے کا وقتاً فوقتاً

عمدہ ثبوت پیش کیا ہے۔اس اعتبار سے زیرِ نظر مقالہ اپنے مندرجات کی بنیاد پر دلچسپی کا
حامل ہے جسے قارئین ترسیل توجہ سے پڑھیں گے۔

اہم اصطلاحات: مشترکہ تہذیب،اسلوب،تخئیل،تقسیمِ برصغیر،دعوت،امن،ثقافتی بوقلمونیت،الرسالہ، جمالیات،انشائیہ ،مضمون،اسلامی روایات۔

اردو ادب کا مزاج بنیادی طور پر زمین سے وابستگی سے عبارت ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکیسویں صدی کے آغاز سے قبل بھی سیاسی،تہذیبی اور اقتصادی اسباب وعلل کی بنا پر مغربی ادب کی تقلید اور اثر پذیری کے باوجود اردو ادب اپنی زمین اور زمین کے تقاضوں سے بے گانہ نہ رہ سکی۔بلکہ مقامی تہذیب وتمدن،رسوم ورواج کو اپنی روح میں پیوست کیا۔ اگر چہ اس سے پہلے اردو ادب کا بیشتر سرمایہ علم مشرقی خصوصاً فارسی ادب کے زیرسایہ پروان چڑھا،لیکن اُن اصناف ادب میں بھی باتیں ہمیشہ صرف ہماریاں ہی ہوئیں۔آج تک اردو ادب کی مختلف اصناف کے سانچے میں جس حد تک اس ملک اور اس کے لوگوں کی زندگی،معاشرت،جذبات،اخلاقیات،تہذیب وثقافت کو ڈھالا گیا اُس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

انسان کا سماج سے رشتہ وہی ہے جو زندگی کا سانس سے ہے،ہر سماج اپنی ایک الگ ثقافت وتہذیب کے اردگرد محوِ گردش ہے اور اسی تہذیب کے ذریعے سے انسان کی اصل واقفیت بہم پہنچتی ہے۔یہ تہذیب چند ضروری حالات کی آمیزش ہوتی ہے،جیسے:ارضی،جغرافیائی،اقتصادی،سیاسی،لِسانی،ان حالات نے ہر تہذیب پر الگ الگ طریقوں سے اپنے اثرات مُرتب کئے ہیں،انہی حالات سے انسان کی شناخت اور جذبات وابستہ ہوتے ہیں،جو ادب کے وسیلے سے سامنے آجاتے ہیں،یوں ادب انسانی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے،ادب زندگی اور تہذیب کا عکاس ضرور ہے،لیکن اس کا کام زندگی اور اُس کے مسائل کو جُوں کا تُوں پیش کرنا نہیں،بلکہ یہی وہ نکتہ ہے جہاں ادب،تاریخ،صحافت اور دوسرے مضامین کے بیچ ایک طرح کی سرحد خود بہ خود وجود میں آہی جاتی ہے۔کسی واقعے کو صحیح صحیح نقل کر کے مرتب کرنا تاریخ کا کام ہے اور اس واقعے کی ہو بہو رپورٹنگ کرنا صحافت کے زمرے میں آتا ہے،نہ کہ ادب کے،بلکہ ادب جمالیات کے زمرے میں آتا ہے اور جمالیات انسان کے ظاہر و باطن کا وہ فلسفہ حیات ہے،جو تہذیب وثقافت کی گہرائیوں میں جا کر

زندگی کے سُراغ کو تلاش کرتا ہے، اِن معنوں میں ادب انسان اور اس کے قرب وجوار کا ماحصل جذباتی انداز میں خوبصورتی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ گویا ادب اظہار کی شناخت کا ایک الگ اور مہذب طریقہ اختیار کرتا ہے، جو اسی تہذیب کی گہرائیوں میں پیوست ہوتا ہے اور وہی سے اس کی تشکیل ممکن ہو پاتی ہے، جس کے لئے تخیل اور اسلوب کا ہونا لازمی ہے۔ اسلوب ثقافت کے لسانی ڈھانچے سے جنم لے کر فن کی تخلیق کو یقینی بناتا ہے۔ ایک فرانسیسی ماہر حیاتیات ڈاکٹر بُوفان لکھتے ہیں کہ:

''اسلوب خود انسان ہے۔'' ۱

اسلوب تہذیب کے ظاہر و باطن کو لفظوں میں ڈھال کر انسان کے حقیقی جذبات کو قوت گویائی عطا کرتا ہے۔ جو صرف تخیل کو تخلیق کے قالب میں ہی نہیں ڈھالتا، بلکہ اس کی ترسیل بھی ممکن بناتا ہے اور ادب تخلیق کی ترسیل کے وہ ذرائع پیدا کرتا ہے، جو ایک تہذیب کو دوسری تہذیب یا پھر نسلاً در نسل اُسے پہنچانے میں راہ ہموار کرتا ہے۔

اس اعتبار سے ہندوستان اپنے اندر کئی تہذیبوں کو سمائے ہوئے ہے، اور ہر تہذیب کی اپنی اپنی زُبانیں، بولیاں، رہن سہن اور شناخت ہیں۔ اردو زبان و ادب اس شناخت کی امین ہے، یہ ادب مختلف اصناف کے ذریعے اس تہذیب کی ترسیل کو ممکن بناتا آیا ہے۔ اردو شاعری کی بیشتر تخلیقات کا خمیر ہی ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے اُٹھا ہے۔ شاعری میں موضوعات، بحروں اور الفاظ کے انتخاب اور تشبیہات و استعارات کے استعمال غرض ہر معاملے میں ہندوستانی تہذیب کے مختلف النوع عناصر کو بڑے خلوص اور فن کاری کے ساتھ برتا گیا ہے۔ یہاں تک کہ صوفیانہ اشعار میں بھی ''سمت کاشی سے چلا ہے جانبِ متھرا بادل'' کی تمہید باندھی گئی ہے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فراقؔ اور خاص طور پر نظیر اکبر آبادی نے ہندوستانی تہذیب کا وہ نگار خانہ پیش کیا ہے، جس میں یہاں کی سماجی، معاشی، تہذیبی، ثقافتی زندگی کے تمام پہلو اپنی اصلی صورت میں جلوہ گر ہیں۔ یہ کہانی یہیں تک محدود نہیں بلکہ یہ تسلسل افسانوی ادب میں بھی رواں دواں نظر آ رہا ہے۔ اردو کے شاہکار نثر نگار جس حد تک داستان، ڈرامہ، افسانہ اور ناول وغیرہ کے فن سے واقف تھے، اُس سے کہیں زیادہ اُنہیں ہندوستانی تہذیب کے نشیب و فراز اور اپنے عہد کی زندگی اور زمانہ کے مسائل اور حقائق سے آگاہی تھی۔ اس لئے اردو کے حوالے سے ہمیں جتنے بھی معروف نثری فن پارے ملتے ہیں اُن میں فنی خوبیوں اور اپنے عہد کی زندگی اور زمانہ کی عکاسی اور تجزیہ کے ساتھ ساتھ مسائل کو جھیلنے اور حقائق کو سماجی و تہذیبی پہلوؤں کے ساتھ برتنے کا بھی سلیقہ ملتا ہے۔ مسجد ہو یا مندر، گردوارہ ہو یا کلیسا، گھر

ہو یا کھیت، امیر ہو غریب، کسان، مزدور ہو یا زمندار یا پھر نچلے طبقے کا فرد ہو یا اعلیٰ طبقے سے وابستہ کوئی رئیس یا امیر؛ غرض ہر جگہ ان نثر نگاروں کے تخلیق کردہ کرداروں کے مسائل کے حل کے لئے ذاتی یا اجتماعی طور پر جو بھی جہد جہد کرتے ہیں ان میں ہندوستانی تہذیب وتمدن، ہندوستان کی سماجی، مذہبی ہر طرح کے عقائد اور روایات تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی لئے پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، منٹو، قرۃ العین حیدر وغیرہ کی تخلیقی کاوشوں میں عموماً عورت، مندر، مسجد، کھیت، فصل، قرض جیسے الفاظ تہذیبی علامت کے بطور بھی سامنے آتے ہیں۔

اردو کی شعری اور نثری اصناف میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی صرف ان ہی اصناف تک نہیں ملتی، جہاں شاعر اور نثر نگار کسی بھی طرح کے موضوعات کو کسی بھی انداز اور اسلوب میں قلم بند کرنے لئے آزاد نظر آتا ہے۔ بلکہ اردو ادب نے ان اصناف میں بھی ہندوستانی تہذیب کو فراموش نہیں کیا جہاں مذہب، عقیدت، روحانیت، حسن وعشق، جذبات جیسے موضوعات کو برتنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بلکہ قصہ کو قصہ پن کے بغیر بیان کرنا۔ ایسی صورتحال میں ادب کے افسانوی رنگ میں رنگین ہونا بے ادبی کے دائرے میں آجاتا ہے اور نثر کو بغیر قصہ کے مبادیات میں بیان کرنا ادب کا یہ افسانوی حصہ غیر افسانوی رنگ اختیار کر کے قصہ بیان کرنے کے بجائے زندگی اور سماج میں پوشیدہ حقیقی واقعات پر ایک طرح کا مکالمہ اسی ادب کے مختلف اصناف کی ہیت میں قائم کرتا ہے۔

مضمون نویسی کو ہی لیجئے۔ وضاحت، صراحت اور استدلال کے ساتھ کسی ایک بنیادی خیال کے اردگرد محو، علم و حکمت پر مبنی مسلسل تحریر، جس میں منطقی ربط بھی ہو، ایجاز واختصار بھی ہو، روانی اور سادگی بھی پائی جائے اور عالمانہ انداز کے ساتھ ساتھ تجزیاتی بیانیہ بھی نظر آئے، مختصراً حقیقت پر مبنی خیالات جو نثر میں پیش کیے جائیں، ایسی نثر کو مضمون کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اردو میں یہ صنف نظم کی عمر کی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ کیا یہ کوئی درآمدی صنف ہے یا نہیں، اگر اصولی طور دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ اس کی پیدائش اُردو ادب کے بطن سے ہی ہوئی ہے۔ ہماری نظر میں اولین مضامین کے موجد انگریزی ادب کے مانٹین کیوں ہیں؟ اس کی وجہ ہم ہر چیز میں مغرب کے اسیر ہو چکے ہیں اور ادب بھی اس سے نہ بچ سکا۔ مانٹین جب مضامین لکھ رہے تھے، تقریباً اس عہد میں مُلّا وجہی بھی اپنی مشہور تصنیف، ''سب رس'' لکھ رہے تھے۔ اسی اعتبار سے ملاّ وجہی کو اردو کے حوالے سے پہلے مضمون نگار کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ ''سب رس'' کے علاوہ اگر ہم مضامین کے نقوش تلاش کریں تو مضامین کی روایت کی تاریخ ہمیں تذکروں میں مل سکتی ہے۔ یہ یہاں کی تہذیبی روایات

میں پروان چڑھا ہے، جس کی جڑیں اس زمین میں تہ در تہ پھیلی ہوئی ہیں اور جس کے ادب میں مقامی جاندار روایات کی بو دور سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس صنف کا اُسلوب بھی نمایاں ہے اور انشائیہ مضمون سے ہی پیدا ہوا ہے، بلکہ انشائیہ کے ساتھ ساتھ مراسلہ، مقالہ، سفرنامہ، سوانح، خاکہ اور رپوتاژ مضمون نویسی کی ہی مختلف شکلیں ہیں، ایسی مخصوص شکلیں جنہیں ہم ''اصناف'' کا مرتبہ دیتے آئے ہیں۔ انشائیہ ادب کی ایک خاص صورت ہے۔ انشائیہ نگار گپ باز ہوتا ہے، جو کسی بھی موضوع کو غیر سنجیدہ بنا کر نہایت دلچسپ اور خوش بیانی سے قارئین کو سنجیدگی پر اُکساتا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں اس طرح کا بیانیہ انداز اختیار کرتا ہے کہ قاری پر متن کی باریکیاں گراں نہیں گزرتی، بلکہ اس کی بے کیف سنجیدگی اس کے انداز ایک طرح کا اطمینان پیدا کرتی ہے۔

۲۷ جون ۱۹۱۰ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوئے، پطرس بخاری کے شاگرد اور اردو کے معروف انشائیہ نگار کنہیا لال کپور کسی تعریف کے محتاج نہیں۔ ٹکسالی زبان پر اسلوب بیان کی شوخی، بے باکی اور لطیف گفتگو کپور کو ایک منفرد انشائیہ نگار کے بطور سامنے لاتے ہیں۔ وزیر آغا لکھتے ہیں، ''کنہیا لال کپور طنز کے ایک بہترین سرجن اور عمل جراحی کے ماہر ہیں۔ ''کنہیا لال کپور نے اپنے ایک انشائیہ، ''برج بانو'' میں جس خوبصورتی سے مشترکہ تہذیب کو دم گھٹتے پایا ہے، اردو انشائیہ نگاری میں اُس کی نظیر نہیں ملتی۔ مشترکہ تہذیب جو ہندوستان کی خاص پہچان ہے اور جس پہچان نے امیر خسرو کی ہندوی کو اردو کے جمالیاتی نظام میں شیریں کلامی کا سلیقہ سکھایا۔ وہ کیونکر ہمالیہ کی گود سے گر گئی۔ وہ اب بچی نہیں رہی، عورت ہوگئی، حالانکہ ہماری تہذیب کا خاصا یہ ہے کہ اگر میاں بیوی میں طلاق ہو جائے تو عموماً بیٹی کو ماں کے حوالے ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں مشترکہ تہذیب کیونکر پاش پاش ہوگئی۔ اکثریت اس لئے سیخ پا ہے کہ اس کا باپ مسلمان ہے اور یہ بھی کلمہ گو ہوگئی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا کہ اگر یہ مسلمان ہوتی تو کیونکر ہم مذہب بنگالی چچا سے اتنا تنگ آ گیا کہ اُسنے اپنا الگ گھر بنانے کا مطالبہ کیا۔ حالانکہ کپور کافی کوشش میں ہیں کہ وہ ہندوستان میں رہے اور کسی طرح سے کپور نے اپنے معاشرے سے ہزار اختلافات کے باوجود برج بانو کو ہندوستان اپنے ساتھ لایا بھی ہے۔ تاکہ یہ اپنے دیس میں ہی رہے۔ کنہیا لال کپور اس انشائیہ سے یہ بات باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم کتنا بھی چاہیں، اردو کسی نہ کسی صورت میں ہمارے سماج کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑتی رہے گی۔ وہ ''اوشیہ'' اور ''پرنتو'' جیسے الفاظ کا سہارا لے کر یہ حقیقت سامنے لا رہے ہیں کہ اگر چہ اردو کو ہم نے نکالنے کی کوشش بھی کی لیکن لسانی سطح پر ہماری لفظیات میں وہ زبان در آئی ہے، جس کا

کوئی مذہب نہیں بلکہ جو مشترکہ تہذیب کی امین ہے اور اگر حکومت قانون بھی بنائے اور دیوناگری کی جگہ نستعلیق اور نستعلیق کی جگہ دیوناگری یا پھر رومن خط بھی رائج کریں، لیکن عوامی زبان عوامی ہی رہے گی۔ جس کی سب سے بہترین مثال عصرِ حاضر میں ہمارا ہندی سنیما ہے۔ جس کا کوئی مذہب نہیں اس لئے اس کی زبان عوامی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام آدمی پر تھوپی گئی زبان کے بجائے ٹکسالی زبان میں بات کرنا پسند کرتا ہے۔ یہاں عام شخص کی زبان لڑکھڑاتی نہیں ہے، بلکہ اس میں گنگا اور ستلج کی روانی نظر آتی ہے۔ کنہیالال کپور لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔برج بانو ایک خوبصورت عورت ہے، جو پاکستان سے میرے ساتھ ہندوستان آئی ہے ۔۔۔۔کیا مجھے اسے محبت ہے، تو یقیناً اس کا جواب اثبات میں ہے۔۔۔۔۔جس وقت میرا ستارہ عروج پر تھا۔ کوئی بنگالی، گجراتی، سندھی حسینہ میرے حُسن، میرے بھڑک اور طنطنے کی تاب نہ لاسکی۔ میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستان میں ہی رہوگی۔۔۔۔۔۔۔حکومت قانون بنا سکتی ہے، لیکن عوام کے فطری رجحان کو نہیں بدل سکتی۔'' ۲

انشائیہ نگار اس بات کو غلط ٹھہرا رہے ہیں کہ یہ زبان کسی ایک ملک یا مذہب کی زبان ہے، بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب ملک تقسیم ہو رہا تھا، تو اردو زبان کے بڑے ادیب ابوالکلام آزاد کیونکر ہندوستان میں رہے۔ یہ زبان اگر مشترکہ تہذیب کی امین نہیں ہے تو کیونکر اس (کنہیالال کپور) نے، گلزار نے، گوپی چند نارنگ نے، دلیپ کمار نے، راجندر سنگھ بیدی نے، بلونت سنگھ نے، جگن ناتھ آزاد وغیرہ نے اردو زبان کو پاکستان سے اپنے ساتھ ہندوستان لایا اور اسی کو اپنا اُوڑنا بچھونا بنایا۔

انشائیہ کے ساتھ ساتھ مقالہ بھی نثری ادب کی ایک توانا اصنف ہے۔ مقالوں میں معلومات کا دخل رہتا ہے، جسے اس میں فکر خیزی پیدا ہوتی ہے، اس لئے مقالے میں سنجیدگی نمایاں نظر آتی ہے۔ مقالہ نگار حقیقت میں ادبی معلم یا عالم ہوتا ہے، اس کا کام درس وتدریس ہے۔ اس کی باتیں عالمانہ اور حکیمانہ ہوتی ہیں۔ وہ سنجیدہ بات مدبرانہ انداز سے کہتا ہے۔ اس میں متانت کے ساتھ دیانت بھی ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ کار لفاظی نہیں، جسے قاری گمراہ ہو جائے۔ بلکہ یہ قاری کو صحیح سمت کی اور گامزن کرتا ہے۔ حالانکہ مقالے میں انشائیہ کا فن بھی پوشیدہ ہوتا ہے، جو اس کی تحقیقی وتدریسی گفتگو کے اندر روانی اور جادو بیانی پیدا کرتا ہے تاکہ قاری میں اکتاہٹ پیدا نہ ہو جائے۔ لیکن یہ اپنے آپ میں ایک سنجیدہ صنفِ ادب

ہے۔

دراصل مشترکہ ثقافت کے معنی ایک ہی گھر میں رہنے والے لوگوں کے عادات ورسوم ہیں۔ یہ عادات دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ اول لباس، کھانے پینے اور رہنے وغیرہ تک۔ یہ ظاہری عادات ہیں۔ دوم مذہبی امورات وغیرہ۔ یہ باطنی عادات ہے۔ ظاہری عادات ہمیشہ ہر کسی کے ایک ہی ہوتے ہیں، جو ثقافت کی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ حالانکہ باطنی عادات ہمیشہ سے تہذیب کی تعمیر کرتے آئے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں ان عادات کی تشریح ایسے نظریات کی صورت میں کی جاتی ہے کہ اس سے معاشرے کے ظاہری عادات بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ چاہے یہ نظریات سخت ہوں یا آسان اصل میں ان کا تعلق مذہب سے ہوتا ہے اور لوگ مذہب کے ان بدلتے موسموں اور اِن کے رنگ بدلتے کرداروں (جو کسی نہ کسی صورت میں استحصالی بھی ہوتے ہیں) سے سخت تنگ آ جاتے ہیں۔ اگر آپ تاریخ کو کھنگالیں اکثر ایسے ہی نظام کے خلاف کہیں ایک تحریکوں نے جنم لیا۔ جیسے مغربیت (westernization) ہی لیجئے، یہ دراصل عمرانیات (sociology) کی ایک ایسی اصطلاح ہے جو جدید کاری (modernization) کے مترادف ہے۔ جامع اُردو انسائیکلو پیڈیا۔۳، سماجی علوم، میں اس کے بنیادی نکات کے متعلق لکھا گیا ہے، ''قومی تہذیب و ثقافت میں لامذہبیت اور عقلیت پسندی کے اصول کارفرما ہوتے ہیں۔ معاشرہ میں نقل وحرکت کی آزادی کا فروغ یعنی ہر شخص کو جسمانی، سماجی اور نفسیاتی طور پر نقل وحرکت کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔'' (ص ۲۲۰) مارکسی رجحان کو بھی ہم اسی صف میں رکھ سکتے ہیں۔ یہ رجحان باضابطہ ایک تحریک میں بدل کر معاشی انقلاب کی صورت میں سامنے آیا۔ حالانکہ یہ اُس طبقے کے خلاف تھا جو مادی سطح پر صدیوں سے استحصال کرتا آیا تھا، لیکن اس مادیت کے پسِ پشت مذہب بھی اہم کردار نبھا رہا تھا، اس لئے یہ تحریک مذہب سے اتنی بَد دِل ہوگئی کہ معاشی استحصال کے خلاف جو انقلاب شروع ہوا تھا، وہ تحریک خُدا کے ہونے سے بھی منکر ہوگئی۔ اشتراکیت کا یہ نعرہ ''استحصال سے پاک معاشرہ'' نے آہستہ آہستہ سماجی سائنس کی حیثیت سے معاشرے میں اپنی پہچان بناتے ہوئے ادب میں بھی اپنا دبدبہ قائم کیا۔ مارکس نے جو فلسفہ پیش کیا وہ ''جدلیاتی مادیت'' کا تھا یعنی اقتصادیت میں سوچنے کی آزادی، طبقاتی اور غیر مساویانہ سماج کے خلاف بولنے کی آزادی، انسان کو انسان رہنے اور اپنا مقدر بنانے کی آزادی، کھیت میں محنت کے بعد اناج یا پھل کھانے کی آزادی اور اگر کھیت سے روٹی نہیں ملتی تو خوشہ گندم کو جلانے کی آزادی، سماجی ذریعے پیداوار کو بھرپور استعمال کرنے کی آزادی، سماجی استحصال،

بھوک، ذلت، غلامی، افلاس کے خاتمہ کی آزادی۔ایسے مذاہب اور خداوؤں سے آزادی جن کی بنیاد استحصال پر مبنی ہو اور جس نے سوچ پر پہرے بٹھار کھے ہوں۔اگر ہم گہرائی سے مطالعہ کریں،تو ہم پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ہمارے یہاں اب تک جو بھی فساد برپا ہوئے یا جو بھی انقلابات رونما ہوئے اِن کے پس پشت مذہب کا کوئی کردار نہیں بلکہ اس میں مذہبی منتظمین (religious-managers) کا بڑا کردار رہا ہے،جنہوں نے مذہب کو اپنے اپنے انداز سے پیش کر کے جہاں تک اُن کا اپنا اثر ورسوخ ہوتا تھا یا آج بھی ہے وہاں تک مذہب کو اُسی انداز سے سوچنے کا حکم دیا اور آج بھی دے رہے ہیں۔اُسی سوچ سے نظریات پنپنے لگے اور یوں ہر ردعمل کی طرح اس کے خلاف بھی آوازیں بھی اُٹھنے لگیں۔

ہم اس طویل تمہید کے بعد اپنے اول الذکر موضوع کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔کہ کیا اردو کے ادبی یا مذہبی مقالات مشترکہ تہذیب کو فروغ دیتے ہیں یا نہیں؟ مشترکہ تہذیبی عناصر حقیقی معنوں میں مولانا وحیدالدین خان کے مقالات میں ہی نظر آتے ہیں۔جامع ثقافت میں زندگی گزارنے کا ہنر اُن کی تحریریں ہی سیکھاتی ہیں۔مولانا صاحب کا دعوی یہ ہے کہ جب ہم ایک ایسی ثقافت میں رہتے ہیں جو بین مذاہب معاشرے کی متحمل ہو،ایسی صورت میں ہمیں مزاحمت کے بجائے مفاحمت کے ادب کو فروغ دینے پر زور دینا چاہئے۔تاکہ ہم امن کا ذہن تعمیر کر سکیں۔بلاشبہ ہندوستان میں بلاتفریق مذہب ونسل جس مذہبی عالم کی تحریروں کا مطالعہ سب سے زیادہ کیا جاتا ہے وہ تحریریں مولانا وحید الدین خان کی ہیں۔۱۹۲۵ء کے جنوری کی پہلی تاریخ کو اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اس عالم دین نے اعظم گڑھ کے مدرستہ اصلاح سے ہی اپنی تعلیم حاصل کی۔بعدازاں علم دین کی اشاعت کے لئے،''اسلامی مرکز'' کے نام سے نئی دہلی میں ایک دعوتی مرکز کی بنیاد ڈالی۔اس مرکز کا ایک اہم کارنامہ اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں ماہنامہ،''الرسالہ'' کی اشاعت ہے۔اردو زبان میں شائع ہونے والا الرسالہ اپنے آپ میں ایک منفرد رسالہ ہے،جس کا خاص مقصد اسلام کی دعوت عام لوگوں تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اندر منفی سوچ کو مثبت سوچ میں تبدیل کرنا ہے۔مولانا وحیدالدین خان اس بابت خود رقم طراز ہیں کہ:

> ''۱۹۷۶ء میں الرسالہ کے اجراء کے بعد سے جو کام میں کر رہا ہوں،اُس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ میں مسلمانوں کو یہ سبق دے رہا ہوں،کہ وہ منفی سوچ سے اُوپر اُٹھیں اور مثبت سوچ کا طریقہ اختیار کریں'' ۳

مثبت سوچ کیا ہے؟ ایک اور جگہ مثبت سوچ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مثبت سوچ پر قائم رہنے کا ایک ہی فارمولا ہے اور وہ ہے یک طرفہ اخلاقیات، یعنی یک طرفہ طور پر دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ خواہ وہ اچھا سلوک کرتا ہو یا برا سلوک۔'' ۴

ہندوستان میں اردو زبان میں سب سے زیادہ مذہبی کتابیں مولانا وحید الدین خان نے ہی لکھی ہیں۔ اکثر ناقدین کا کہنا ہے کہ مولانا ایک متنازہ عالم دین ہیں، جو اسلام کی صحیح تشریح نہیں کرتے۔ بلکہ اُن کی تحریروں میں فکری گمراہیاں جھلکتی ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا صاحب کی گمراہیوں کے خلاف کہیں ایک کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ جہاں تک مولانا کی تحریروں پر نظر جاتی ہیں، اُن میں مذہبی ہم آہنگی کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ امن پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کی اپنی الگ تشریح وتعبیر امن کے ایسے دائرہ کار میں کرتے نظر آتے ہیں، جس میں اسلامی تعلیمات میں اُن چیزوں پر زیادہ زور دیتے ہیں جہاں یک طرفہ طور امن قائم کرنے کی شرائط زیادہ دیکھائی دے رہے ہیں، جس میں اکثر وبیشتر خود سپردگی (Surrender) کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''پچھلے ہزار سال میں مسلمانوں کے درمیان جو لٹریچر تیار ہوا، اُس میں سب کچھ تھا، مگر اُس میں جو چیز مکمل طور پر حذف تھی اور وہ ہے: دعوت اور اَمن کا تصور۔ اِس کے بعد جب مغربی طاقتوں نے مسلم ایمپائر کو توڑ دیا تو اِس کے خلاف ردعمل کی بنا پر یہ ذہن اور زیادہ پختہ ہو گیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیسویں صدی عیسوی پوری کی پوری، منفی سوچ اور منفی سرگرمیوں کی نذر ہو گئی۔ اِس پوری صدی میں نہ دعوت کا پیغام لوگوں کے سامنے آیا اور نہ اَمن کا پیغام، جب کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ راقم الحروف پر اللہ تعالیٰ نے استثنائی طور پر دعوت اور اَمن کی اہمیت کھولی۔'' ۵

مولانا وحید الدین خان قرآنی واقعات کو یوں بیان کرتے ہیں کہ انسان یک طرفہ طور امن کے لئے تیار ہو کر معاشرے کے تمام طبقات کو اس میں شریک کرنا لازمی سمجھتا ہے، ہماری روایت میں بحث ومباحثہ کو بُرا سمجھا جاتا ہے اور اگر ہم صحیح معنوں میں اپنے گردوپیش پر اس سلسلے میں نظر ڈالیں، تو ہم یہ پائیں گے کہ آج کل بحث ومباحثہ جنگ جیسی صورتحال اختیار کر رہا ہے، جو جامع ثقافت کی روح کو اس طرح مجروع کر رہا ہے کہ دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف

ہولناک آگ جل رہی ہیں۔ یہ اس قدر ہولناک ہے کہ علم بھی مشترکہ نہیں دیکھائی دے رہا، جبکہ علم اس وقت تک فروغ نہیں پاسکتا، جب تک وہ قوت استدلال سے بھرپور نہ ہو۔ سماجی سطح پر قوت استدلال کی تربیت کرنا لازمی ہے، لوگوں کو بتایا جائے کہ تخریبی اور تخلیقی استدالال میں کیا فرق ہے؟ عصر حاضر میں ہم زیادہ تر منفی استدلال کا مشاہدہ کرتے نظر آتے ہیں، مکالمہ میں ضروری ہے کہ دوسرے کی بات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی جائے اور بحث ومباحثہ میں عقائد پر استدلال کرنے سے گریز کیا جائے۔ ورنہ اس سے فرقہ واریت کے جنم لینے کا خدشہ ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم آنے والی نسل میں دلائل کے ساتھ مباحثوں کے رجحان کو فروغ دیں، تاکہ ایک صحت مند ذہن تیار ہو جائے۔ ہمیں ذہنی سطح پر شدت پسندی کی وجوہات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ وہ چیزیں اپنے ہاتھ میں نہیں لینی چاہیے جو کام سرکاری اداروں کا ہو؟ بدقسمتی سے ہمارا طبقات پر مبنی نظام تعلیم غیر شعوری طور پر سائنسی فکر، تخلیقی سوچ اور تنقیدی صلاحیت سے بھرپور محقق تیار کرنے کی بجائے طبقاتی تفریق کو بڑھا رہا ہے اور جو جوڑنے کے بجائے توڑنے کا سبب بن رہا ہے۔ مولانا صاحب کہتے ہیں کہ ہم جس زمین پر ہیں وہ ہماری نہیں بلکہ خدا کی ہیں اس لئے ہمیں خدا کے رہنماہ کردہ اصولوں کے تحت یہاں زندگی گزارنی ہوگی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک امریکی خاتون سیاحت کی غرض سے روس گئیں، وہاں اُنھوں نے دیکھا کہ ہر جگہ کمیونسٹ پارٹی کے چیف کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ یہ بات اُنھیں پسند نہیں آئی۔ ایک موقع پر وہ کچھ روسیوں سے اِس پر تنقید کرنے لگیں۔ خاتون کے ساتھی نے اُن کے کان میں چپکے سے کہا: 'میڈم! آپ اِس وقت روس میں ہیں، امریکہ میں نہیں ہیں۔' آدمی اپنے ملک میں اپنی مرضی کے مطابق رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ کسی غیر ملک میں جائے تو وہاں اُس کو دوسرے ملک کے نظام کی پابندی کرنی پڑے گی۔ اگر وہ وہاں کے نظام کی خلاف ورزی کرے تو مجرم قرار پائے گا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ وسیع تر معنوں میں دنیا کا ہے، انسان ایک ایسی دنیا میں پیدا ہوتا ہے جس کو اُس نے خود نہیں بنایا ہے۔ یہ مکمل طور پر خدا کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ گویا انسان یہاں اپنے ملک میں نہیں ہے ، بلکہ خدا کے ملک میں ہے۔'' ٦

مولانا صاحب جنوری ۲۰۰۹ء کے الرسالہ میں، ''کامیاب زندگی کا سفر'' کے عنوان سے اپنی بات کو ادبی انداز میں ناول کے حوالے سے سمجھاتے ہیں کہ ناول کی کامیابی کا راز اس میں ہے کہ وہ کتنی المیہ پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا

معاشرہ ویسے معاشرے کا ادب۔ یہاں آدمی مایوسی کے احساس میں زندگی بسر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ المیہ پر مبنی ناول اس کے ذہن و دل کو چھو لیتے ہیں۔ اس کے برعکس مزاحیہ قسم کے ناول اس کے ذہن و دل کے معیار کے نہیں باتے۔ چونکہ انسان پیدائشی اعتبار سے مثالی بن کر رہنا چاہتا ہے۔ جب اسے مثالی زندگی میسر نہیں ہو پاتی، تو وہ مایوسی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اصل میں ہمیں خدا کے تخلیقی طریقہ کار کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جس نے یہ طریقہ کار سمجھا، اِسے موجودہ دنیا آزمایشی نظر آئے گی اور آخرت مثالی۔

ستمبر ۲۰۰۹ء کے الرسالہ میں ''دوسرا شجر ممنوعہ'' کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہنا چاہتے ہیں کہ جنت سے آدم کو اس لئے نکالا گیا کہ اُنہیں یہ نصیحت کی گئی تھی کہ اُنہیں جنت میں مکمل آزادی دی گئی ہے۔ لیکن شجر ممنوعہ کی طرف نہ جائیں۔ اُنہوں نے اللہ کی بات نہ مانی۔ اس طرح وہ جنت سے نکال کر زمین پر لائے گئے۔ لیکن زمین دوسرا شجر ممنوعہ ہے اور اُنہوں نے زمین کے شجر ممنوعہ کو ''تشدد'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی تعبیر یہ ہے کہ، جنہوں نے یہاں تشدد کو تھامے رکھا، اُنہیں جنت سے محروم کیا جائے گا۔ مولانا صاحب اس تشدد کو سمجھانے کے لئے آدم کے دو بیٹوں ''قابیل'' اور ''ہابیل'' کی مثال قرآن کی سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۳۲ کے حوالے سے دیتے ہیں کہ؛ ''جو شخص کسی کو قتل کرے، بغیر اس کے کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین پر فساد برپا کیا ہو، گویا اُس نے سارے آدمیوں کو قتل کر ڈالا'' وہ موجودہ دنیا میں تشدت سے پاک ماحول بنانے کے خواہاں ہیں۔ اس کے لئے وہ اللہ سے ڈرنے کا درس اس طرح دیتے ہیں کہ یک طرفہ طور صبر کا دامن تھاما جائے، جس سے دنیا میں تشدد کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں وہ ایک بار پھر اُسی موضوع کی اور واپس آتے ہوئے آدم کے دو بیٹوں ''قابیل'' اور ''ہابیل'' کی مثال قرآن کی سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۲۸ کے حوالے سے دیتے ہوئے سمجھاتے ہیں کہ اس آیت میں ہابیل نے قابیل کو کہا ''یعنی اگر تم مجھے قتل کرنے کے لئے اپنا ہاتھ اُٹھاؤں گے، تو میں تم کو قتل کرنے کے لئے اپنا ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو سارے جہاں کا رب ہے۔'' کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہابیل نے یک طرفہ طور صبر کا دامن تھاما۔ یوں اُس نے تشدد کا ساتھ نہ دے کر شجرہ ممنوعہ کی راہ ترک کی۔ اسی دفتر کو مزید وا کرتے ہوئے مولانا صاحب، ''سنن ابی داؤد''، ''کتاب الفتن'' کے حدیث کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں (حدیث نمبر نہیں دیا گیا ہے) کہ رسولؐ نے فرمایا کہ بعد کے زمانے میں سیاسی بگاڑ پیدا ہوگا، مگر تم اپنے حکمرانوں سے ہرگز ٹکراؤ نہ کرنا۔ ایک صحابی نے کہا کہ اگر وہ خود ہمارے گھر میں ہمیں مارنے کے لئے آجائیں تو ہم کیا کریں۔ آپؐ نے جواب دیا، ''تم آدم کے دو بیٹوں میں سے

اچھے بیٹے بن جاؤ۔یعنی خواہ تم دوسرے کے ہاتھ سے قتل بھی ہو جاؤ،مگر تم دوسروں کو قتل کرنے کی کوشش نہ کرو۔اب مولانا صاحب یہی پر بات ختم نہیں کرتے ، بلکہ وہ تشدد کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔جس میں ایک طرح کے تشدد کو وہ غیر فعال تشدد (passive violence) اور دوسرے تشدد کو فعال تشدد (active violence) کے نام سے تعبیر کرتے ہوئے کہنا یہ چاہتے ہیں کہ غیر فعال تشدد یہ ہے کہ تم دوسروں کو ظالم بتا کر اُن سے نفرت کرو اور فعال تشدد یہ کہ تم ظالم کے خلاف عملی طور تشدد کی کاروائی شروع کرو۔دونوں طرح کے تشدد گناہ ہیں۔قصہ مختصر یہ،شجرہ ممنوعہ سے پرہیز یہ ہے کہ تشدد کے خلاف ذہنی طور بیدار ہو جائیں اور اپنے ذہن سے تشدد کے بارے میں سوچنا بھی حرام کر دیا جائے۔جب ذہن صاف وشفاف ہو جائے گا تشدد کے لئے کوئی جگہ نہیں رہے گی۔

مولانا وحید الدین خان ایک ایسا ذہن تیار کرنے کے خواہشمند ہیں،جس کے اندر تشدد یا فساد جیسے الفاظ کی کوئی جگہ نہ ہو۔وہ فساد کے بعد فساد قابو کرنے کو لیڈری سے تعبیر کرتے ہیں، بلکہ اُن کے نزدیک زمین پر فساد کے لئے کسی قسم کی فضا ہی نہیں ہونی چاہئے۔وہ حضرت یوسف کا حوالہ دیتے ہیں،جس نے مشرک حکمران کے زیر سایہ پرورش پائی۔لیکن حضرت یوسف نے کبھی بھی اُس کے خلاف کوئی مورچہ نہیں کھولا۔حالانکہ اُس کے اندر عداوت کا ذہن تعمیر ہونا چاہئے تھا،کیونکہ اُسے ایک ایسے الزام میں قید کیا گیا،جو سراسر جھوٹ پر مبنی تھا۔اس کے برعکس جب وہ خود منصبِ اعلیٰ پر فائز ہوئے ،پھر بھی اُس نے جواب میں کسی بھی قسم کی انتقامی کاروائی نہیں کی۔جن بھائیوں نے اُسے مرنے کے لئے کنویں کی نظر کیا تھا اُنہیں معاف کیا۔قرآن جب حضرت یوسف کا یہ قصہ بیان کرتا تو اس کے پس پشت یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ہمیں اپنے اندر مشترکہ تہذیب میں زندگی بسر کرنے کے عادات پیدا کرنے چاہئے۔اور مولانا کے مطابق یہی اسلامی طریقہ بھی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اسلوب کیا ہے،نثار احمد فاروقی،اردو نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ (مُلا وجہی سے سبط حسن تک)،مُرتب،عقیلہ جاوید،

ص۱۲۔

۲۔ برج بانو، کنہیالال کپور، ساقی بک ڈپو، دہلی، ص۵، ۷، ۹۔

۳۔ خاتون اور اسلام، مولانا وحیدالدین، ص۲۰۷،

۴۔ ماہنامہ الرسالہ، مولانا وحیدالدین، جون ۲۰۱۱ء، ص۲۴۔

۵۔ ماہنامہ الرسالہ، مولانا وحیدالدین، جولائی ۲۰۱۰ء، ص۲۳، ۲۴۔

۶۔۵۔ ماہنامہ الرسالہ، مولانا وحیدالدین، ستمبر ۲۰۰۶ء، ص۳۵۔

رابطہ:

ڈاکٹر عرفان عالم

ایسوشیٹ پروفیسر

شعبۂ اردو، مرکزی جامعہ کشمیر

گاندربل۔192101

موبائل: 9419009667 91+

ای میل:aalamirfan@gmail.com